''کانٹے'' (انشائیوں کا مجموعہ) کا مطالعاتی جائزہ

ڈاکٹر بشیر احمد شاہ
کنٹریکچول لیکچرر (اُردو)
گورنمنٹ ڈگری کالج پلوامہ، کشمیر

''کانٹے'' کشمیری انشائیوں کا ایک مجموعہ ہے جسے آزردہؔ صاحب نے بعد میں خود ہی اردو میں ترجمہ کیا یہ کتاب ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ، خدا بخش خان لائبریری پٹنہ نے ۱۹۸۹ء میں شائع کیا۔ ۱۹۹۲ء میں فکشن پبلشر لاہور سے بھی یہ کتاب شائع ہوئی جس پر پاکستان ٹائمز نے تفصیلی تبصرہ کیا۔ انشائیوں کا یہ مجموعہ تقریباً بیس (۲۰) انشائیوں پر مشتمل ہے جن میں ''زبان اور تہذیب'' ''گدھ'' ''چمچہ گری'' ''کانگڑی'' ''دیمک'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آزردہؔ صاحب اپنے انشائیوں سے قاری کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ فلسفیانہ افکار کو عام لفظوں میں پیش کر کے قاری کو اپنے اعتماد میں لے لیتے ہیں اس سلسلے میں ایک مثال یوں پیش کی جاسکتی ہے:

> ''ایک مثال میں یہاں عرض کرونگا کہ اردو میں کہتے ہیں۔' آپ سے آئے تو آنے دو' اس کے پیچھے ایک دلچسپ واقعہ ہے کہا جاتا ہے کہ ایک دن نوکر نے اپنے مالک ملا سے پوچھا کہ آپ کے لیے کیا سالن پکائیں؟ اس نے جواب میں کہا کہ تم لوگوں نے اپنے لیے کیا پکایا؟ نوکر نے کہا کہ ہم نے ہمسایہ کی مرغی ذبح کی ہے ملا نے کہا توبہ توبہ! میں وہ کیسے کھا سکتا ہوں خیر پانی تو اس میں اپنے کنویں کا ہوگا اور مسالے بھی گھر کے ہوں گے۔ گھر ہی کے بالن سے پکائی جائے گی مرغی کو تم لوگ کھاؤ، میں شوربا'' لے لوں گا۔ شام کو ملا جلدی گھر کے اندر گیا۔ کھانا سامنے آگیا تو اس نے بیوی سے کہا کہ میرے لیے کٹوری میں شوربا ڈالدو۔ اس نے ہانڈی میں سے شوربا انڈیلنا چاہا۔ اور اس میں ایک دو بوٹیاں بھی آگئیں، بیوی نے چمچ سے بوٹیوں کو نکالنا چاہا تو ملا نے منع کر دیا اور کہا کہ'' آپ سے آیے تو آنے دو'' بیوی نے کہا کہ مرغی بھی تو آپ ہی آئی تھی۔ ہم نے اسے اپنے صحن میں پکڑ لیا۔ ملا نے کہا پہلے ہی آپ لوگوں نے کیوں نہیں بتایا۔ اب جسے یہ پس منظر معلوم ہو اس کے لیے یہ محاورہ بڑا دلچسپ ہے''[۱]

آزردہ صاحب نے ایک اور انشائیہ ''گدھ'' میں وادیٔ کشمیر کی خوبصورتی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ کشمیر جنتِ بے نظیر ہے۔ جس کے دیکھنے کی آرزو دنیا کے ہر انسان کو ہے ہر ملک کا آدمی آتا ہے اور سیر کر کے واپس چلا جاتا ہے۔ اور نئے لوگوں کے دلوں میں کشمیر کو دیکھنے کی امنگ پیدا کرتا ہے۔ انسانوں کی طرح پرندے بھی کشمیر کے سبزہ زاروں، ندیوں، پہاڑوں کی چوٹیوں اور گلستانوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ باہر سے آنے والے ان پرندوں میں گدھ بھی ہے، جو کشمیر کی فضا کو آلودہ کر دیتا ہے۔ آرزو صاحب لکھتے ہیں:

''گدھ جو آپ جانتے ہیں کہ ہر جگہ بدتمیز اور بدشگن مانا جاتا ہے مگر کشمیر آ کے یہ بڑا سلیقہ مند ہو جاتا ہے یہ قحط، خشک سالی اور گرمی کو بھلا کے بوالہوس پھول چور بن جاتا ہے۔ یہ اپنی چونچ سے خوبصورت اور ہنستے پانی کو گندہ کر دیتا ہے یہ اپنی مسموم سانس سے خوشبو سے مہکتے ہوئے باغوں میں زہر گھولتا ہے۔ یہ معصوم دلوں کو اپنی چونچ مارنے کی عادت سے کرچیوں میں بدلتا ہے یہ پھول سے چہروں کو اپنے پنجوں سے مسخ کر دیتا ہے مگر کیا کہیئے کہ باغبان کو یہی پسند ہے وہ خوش ہے اس نے باغ کے ایک سرے پر اپنے لیے ایک کٹیا بنالی ہے ایک گدھ ہمہ وقت پہرہ دیتا رہتا ہے کہ کہیں بلبل اس کو تکلیف نہ پہنچائے یا کہیں پھول اپنی خوشبو اس تک نہ پہنچائے کہ زکام ہو جائے۔ آنکھیں اور کان بند کرنا تو سننے میں آیا ہے لیکن اس نے ناک کو بھی بند کر دیا ہے اور زبان پر بھی تالہ چڑھایا ہے اور عارض کی زبان سے کہتا ہے باہر کا دوست بادام کے باغوں میں بہار کا لطف اٹھاتا ہے اور کشمیر اس کے باوجود راگ الاپتا ہے کہ چمن میرا ہے فضا میری ہے'' ۲

آزردہ صاحب نے اپنے انشائیوں میں چاپلوسی کرنے والوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اپنے انشائیہ ''چمچہ گری'' میں ان خیالات کا اظہار بڑی خوش اسلوبی سے کیا ہے ان کے مطابق آج کل ہر بات چمچے سے شروع ہو کر چمچے ہی پر ختم ہو جاتی ہے اور چمچے کی تعریف یوں کرتے ہیں:

''ہر کام میں زوال ہے سوائے چمچہ گری کے دس افسر بدل جائیں، وزارتیں تبدیل ہوں۔ منصوبے رک جائیں یا آگے بڑھیں چمچوں کو سب سے پہلے اپنا حصہ لینا ہے آج کے زمانے میں جب کہ لوگوں کے پاس فرصت کم ہے افسر اپنی چمچہ گری میں مصروف ہیں اس لیے چمچوں کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے اصلی کام جو ہوتا ہے وہ چمچوں کے کٹ کٹ کرتے رہنے سے ہی ہوتا ہے کسی

کو ترقی ملے یا کوئی معطل ہو جائے، کوئی کھانا کھائے یا فاقے سے رہے، چمچوں کا اس میں بڑا دخل ہوتا ہے آپ ایک سالن پسند کریں یا دوسرا، دوست کے گھر میں کھائیں یا اپنے گھر میں ہوٹل میں ہوں یا کہیں اور لیکن چمچے ساتھ رہیں گے۔ چمچہ گری کوئی آسان کھیل نہیں جس نے اس فن کو سیکھا اور اچھی طرح سے برتا اس کے دوست، رفیق اور عزیز اور رشتہ دار سب عیش کرتے ہیں۔ اگر خاندان میں ایک ہی چمچہ ہو باری باری سب کی پیاس بجھے گی۔ مجھے تعجب ہے کہ آج تک کسی نے اس کو اپنا چناؤ نشان نہیں بنایا۔ جو بھی اپنا چناؤ نشان چمچے کو بنائے وہ ضرور جیتے گا۔ اس میں آپ یا میں کیا کر سکتے ہیں یہ اپنے فن کی بات ہے''۔۳

اسی طرح آزردہ صاحب نے ایک اور انشائیے ''دیمک'' میں بڑے دل چسپ انداز میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ قاری انکی طرف راغب ہو جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو کپڑا جتنا نرم، خوبصورت اور قیمتی ہو، دیمک، اس کی اتنی ہی عاشق ہوتی ہے اسی طرح جو انسان عاقل، سوچنے والا اور باکمال ہو اس کے پیچھے اتنے ہی غم اور فکریں ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ بے ایمان کا شیطان کیا بگاڑے گا وہ پہلے ہی بگڑ چکا ہوتا ہے بے زر آدمی کہیں بھی سو سکتا ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو اسے کسی چیز کی پرواہی نہیں ہوتی۔ یہ ساری تکلیفیں اور مصیبتیں سوچنے والے کے لیے ہیں۔ اس کے ساتھ اگر معمولی بات بھی ہو تو جان نکلنے لگتی ہے۔ اسی طرح کشمیری بھی بڑا حساس ہے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب بھی ہمارا طالب علم کہیں باہر پڑھنے کے لیے چلا جاتا ہے اور کسی ہوسٹل میں رہتا ہے تو Mess کا انچارج اسی کی رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ اسے دور ہی سے سمجھ میں آتا ہے کہ چاول جل گیا ہے یا سبزی جل گئی ہے یا سالن سڑ گیا ہے یہ اتنا حساس ہے کہ اسے مارنا بہت آسان ہے ہر کشمیری چاہے وہ حاکم ہو یا ادنیٰ انسان اس کے پیچھے کسی نہ کسی بہانے بیربل کا گیدڑ رکھا گیا ہے جوں ہی وہ بے فکر ہونے لگتا ہے تو یہ گیدڑ چیختا ہے یہ اگر سیدھے راستے پر بھی جا رہا ہو تو پھر بھی گیدڑ چیختا ہے کیونکہ اس کا کام یہی ہے اور اس بیچارے کی جان نکلنے لگتی ہے''۔۴

ایسا لگتا ہے کہ آزردہ صاحب نے ان میں سے کچھ انشائیے دونوں زبانوں میں لکھے ہیں جیسے ''تحریر اور

تصویر'' دونوں کو پڑھنے سے قطعاً یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہوئے ہیں بلکہ لگتا ہے کہ اصلاً اردو میں ہی لکھے گئے ہیں یہی حال انشائیہ ''کانگڑی'' کا بھی ہے جس روانی کا احساس ان انشائیوں کی زبان میں ہوتا ہے وہ ترجمے میں ممکن نہیں اس کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ آزاد۔ترجمے ہیں جن میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ یہ اردو قارئین کے مزاج پر کسی طرح سے بار نہ ہوں یہ انشائیہ پڑھتے وقت قاری ویسے ہی لطف اندوز ہوتا ہے جیسے ترجمہ نہیں بلکہ اصل متن پڑھ رہا ہوں۔تخلیقی اعتبار سے بھی یہ انشائیے آزردہ کی طبعت اور فن سے میل کھاتے ہیں۔ڈاکٹر منصور احمد میران انشائیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آزردہ صاحب کے انشائیوں میں صرف ذہنی ترنگ کی کارفرمائی ہی نہیں ملتی اور یہ صرف ایک مخصوص موڑ کے زائیدہ ہی نہیں بلکہ ان میں بھرپور مقصد برآوری بھی رنگ بکھیرتی نظر آتی ہے ان کے انشائیوں میں ان کا مذاق نہ صرف بلند بلکہ بے حد صاف ستھرا بھی ہے وہ اپنے نکھرے ذوق اور نفاست سے اپنے تجربات، مشاہدات گردوپیش کے واقعات اور متنوع کیفیات کے دیدنی اور نادیدنی کے اور ان کہے پہلوؤں کو فنکارانہ شعور کے ساتھ پیش کرتے ہیں''۵

میں ڈاکٹر منصور احمد کے خیال سے پوری طرح متفق ہوں۔آزردہ صاحب کے فنکارانہ شعور نے ان کے انشائیوں کو ادب کی قابل قدر صنف بنا دیا ہے۔

مشہور براڈ کاسٹر سابق ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کا آزردہ صاحب کی انشائیہ نگاری کے بارے میں یہ بیان بھی اہمیت کا حامل ہے:

> آزردہ صاحب شگفتن ذات سے انکشافِ ذات کا سفر کرتے ہیں۔اور ہمارے ہاتھوں میں جام جہاں نما دے کر سارے عالم کا نظارہ کراتے ہیں۶

''شگفتن ذات وانکشاف ذات'' یہ دونوں ایسی تراکیب ہیں جن کی ابتداء خودشناسی سے ہوتی ہے اور جو دنیا کے لیے نظارگی کا سامان مہیا کراتی ہے۔

سُن تو سہی:۔(انشائیوں کا مجموعہ)

محمد زماں آزردہ زندہ دل شخصیت کے مالک ہیں ان کے انشائیوں کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انکی شخصیت کے کئی پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ان کی پسند ناپسند طور طریقے، رہن سہن وغیرہ جیسی کئی چیزوں کا علم ہوتا ہے۔

میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے ہیں:

''آدمی جتنا شریف ہو اتنے ہی بڑے وعدے کرے گا لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں ہے سیاست دان بھی بڑے وعدے کرتے ہیں۔ الیکشن سے پہلے یہ وعدے عجیب نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سمندر کا پانی خشک کر کے اس میں غریبوں کے لیے مکانات بنائے جائینگے۔ پڑھے لکھے لوگ ان پڑھ لوگوں کا استعمال کرتے ہیں ان کو شہر بدر کیا جائیگا۔ رشوت خوری ختم کی جائیگی۔ جو ہم کو ووٹ دے گا۔ اس کی زندگی آرام سے گذرے گی۔ الیکشن کے بعد اس کو کوئی کام کاج کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس کے پاس مکان نہیں ہوگا ان کو جیل خانوں میں بسا دیا جائیگا۔ بھلا بتائیے یہ بھی کوئی وعدے ہوئے جو پورے کیے جاسکتے ہیں لیکن سادہ لوح لوگوں کا کیا کہا جائے وہ ہر الیکشن کے بعد سمندر کے خشک ہونے کا انتظار کرتے ہیں کہ ان کے لیے مکان بن جائیں گے۔ یہی حال مدیر کا ہوتا ہے جو ہر نمبر چھاپتے وقت اس انتظار میں رہتا ہے کہ جس مصنف نے دس بار وعدہ کر کے اس کے رسالے کے لیے مضمون نہ لکھا وہ اس نمبر کے لیے لکھے گا۔''

آزردہ صاحب اپنے انشائیوں میں مزاحیہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں تا کہ پڑھنے والے لطف اندوز ہوسکیں اس کی ایک مثال یوں پیش کرتے ہیں۔

''ہمارے ایک دوست ہمیشہ ہی خضاب لگاتے تھے عمر میں ہم سے زیادہ بڑے نہیں تھے صرف سات آٹھ سال مگر صاحب ان کی داڑھی اور سر کے بالوں کا سن اکیس (۲۱) برس سے آگے نہیں بڑھنے پایا۔ ہم دونوں عموماً ساتھ رہتے تھے۔ مان لیجئے ہم دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ تھے وہ ہمارا ماضی نظر آتے تھے اور ہم ان کا مستقبل ملنے والے انہیں بھائی جان کہتے تھے۔ اور ہم کو انکل۔ ایک میز پر ہم بھی ساتھ بیٹھے ہوتے تو ہماری موجودگی ان کو کبھی کبھی کھلتی تھی حد تو یہ ہے کہ بیشتر اوقات یہ خود بھی ہم کو انکل کہہ کے پکارتے تھے یوں تو ہم ان کی اس ادا سے بہت محفوظ ہوتے تھے لیکن کبھی کبھی جب ہم تنہا پڑتے تھے تو کھلتا بھی تھا مگر صاحب کیا کیجئے۔ انہوں نے اپنی عمر پر ایسا پردہ چڑھا دیا تھا جس کے اٹھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی یہ پردہ وہ اس باقاعدگی اور

ایسی مضبوطی سے چڑھائے رکھتے تھے کہ اب وہ ہمارے بھتیجے مشہور ہو گئے تھے''۸

آزردہ صاحب کا کہنا ہے کہ خضاب لگانے والا اپنے بوڑھاپے اور بزرگی کے آثار کو عیب سمجھتا ہے ورنہ اسے چھپانے کی ضرورت کیوں پیش آئے اگر چھپانا ہی مقصود ہے تو اپنے عیوب کو چھپایئے۔ وہ تو خضاب کے ساتھ اور بھی نمایاں ہوتے ہیں:

''عمر کے ساتھ بھی کچھ یہی ہے اسے آپ خضاب سے چھپایئے لیکن کب تک! ایک نہ ایک دن خضاب کا یہ لباس ضرور تار تار ہو جاتا ہے۔ پھر سفید داڑھی سے چہرے کی وجاہت اور بشاشت دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کو آپ خضاب کی نذر کرتے ہیں آپ کہیں سفر میں ہوں اور موقع نہ ملے تو بالوں کی سفیدی خضاب کی سیاہی کے نیچے سے جھانکنا شروع کر دیتی ہے''۹

آزردہ صاحب کا انداز بیان بالکل مختلف ہے۔ ان کے انشائیوں میں دوسرے انشائیہ نگاروں کے مقابلے میں ایک اہم خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ ان کی نظر موضوع کے مختلف پہلوؤں پر رہتی ہے۔ ان کے ایک انشائیہ ''یہ بھی ایک فن ہے۔ لباس اور وضع قطع اختیار کرنا'' میں کس طرح وہ لباس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پیشے کے اعتبار سے بھی لباس کی وضع قطع میں فرق آجاتا ہے تھا مثلاً تنگ لباس پہننے والے عموماً میز کرسی کے استعمال کرنے والے یا فیکٹریوں میں کام کرنے والے سمجھے جاتے تھے سماجی رتبہ بھی لباس کے پہننے پر کچھ پابندیاں عائد کرتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ جنس اور عمر لباس کی وضع قطع کے اختیار کرنے میں خاص طور سے رہنمائی کرتے تھے اب لباس کا عالم یہ ہو گیا کہ فوراً ہی مرد اور عورت میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے وہی شرٹ اور پتلون یا جیکٹ اور پتلون غرض ۔ع

''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی''

عمر کا خیر اب کوئی لحاظ ہی نہیں۔ ہر عمر کے آدمی خوب بھر کے لیے رنگ اور جدید وضع قطع کے لباس کا استعمال کرتے ہیں۔ ہم یہ سب رقابت کی وجہ سے نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ مسئلہ صرف یہ ہے کہ جب باپ اور بیٹا، ساس اور بہو، ماں اور بیٹی کہیں ایک ساتھ نظر آجائیں تو دیکھنے والے اس لائق رہیں کہ ان میں تمیز کر سکیں۔ ہم جب عمر رسیدہ اساتذہ

کو پرنٹ شرٹس پہنے دیکھتے ہیں تو ان کے انتخاب پر رشک آتا ہے''۱۰

اسی طرح آزردہ صاحب ایک اور جگہ بے تکلف انداز میں ہمیں یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وعدہ کر کے اس کو پورا کرنے میں کس طرح کی پریشانی اور پشیمانی اٹھانی پڑتی ہے وہ لکھتے ہیں:

''ایک بات ہم ضرور کہنا چاہیں گے وہ یہ کہ وعدہ کرنے والا اگر اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکتا تو اس میں بیشتر اس کا کم اور حالات کا قصور زیادہ ہوتا ہے ہم جیسے پروڈیوسر سے وعدہ کرتے ہیں کہ تین بجے پہنچیں گے اور ہم اسی ارادے سے گھر سے نکلتے ہیں مگر بس اسٹینڈ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہمارا حساب و کتاب ضائع ہوگیا۔ ہم نے جوڑا تھا کہ بیس (۲۰) منٹ میں ریڈیو پہنچیں گے اور ہوا یہ کہ پچیس (۲۵) منٹ تک بس ہی کے انتظار میں کھڑے رہے پروڈیوسر الگ پریشان اور ہم سر راہ الگ پشیمان''۱۱

انسان کی زندگی میں ایسے نشیب فراز آتے ہیں کہ وہ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجیدہ ہوجاتا ہے اور یہ رنجیدگی اسے بڑی بڑی باتوں سے محظوظ ہونے کا موقع نہیں دیتی۔ آدمی گھر میں اگر ہر چیز کو دھیان سے دیکھے تو اس کی پریشانی میں اضافہ ہوجائے گا اور یہی انسان اگر ان چیزوں پر سرسری نگاہ کریں اور ان کے مثبت پہلوؤں پر دھیان دے تو اس کی زندگی ہنسی خوشی گذر سکتی ہے اکثر لوگ گھر میں روتے بسورتے نظر آتے ہیں اصل میں ہوتا یہ ہے کہ وہ ہر چیز اور ہر واقع کے تاریک پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور ان کے اندر چھپے ہوئے خوشکن پہلوؤں پر دھیان نہیں دیتے۔ آزردہ صاحب گھر کی چار دیواری کے اندر جب ایسے چھوٹے بڑے واقعات کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں تو انہیں ہر چیز میں خوشی کے پہلو وافر تعداد میں ملتے ہیں ان کا انشائیہ ''مزاح گھر کی چار دیواری میں'' جو تین قسطوں میں لکھا گیا ہے ان کے مزاج کی بھرپور عکاسی کرتا ہے:

''آدمی ذہین ہو تو گھر کی چار دیواری میں ہونے والے واقعات سے وہ ہر وقت مزاح کا سامان پیدا کرسکتا ہے بعض لوگوں کو اس پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ سنجیدہ لوگ ایسا نہیں کرتے اصل میں یہ خیال سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے اچھا صاحب! آپ غور فرمائیں کہ ایک آدمی جو گھر میں رہ رہا ہے جس نے رضا کارانہ طور پر گھر کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا ہے وہ کوئی غیر سنجیدہ ہے کیا؟ اس کے مقابلے میں پنچایت اور پارلیمنٹ کا رکن کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو چند برسوں کے لیے ان ایوانوں کا ممبر ہوجاتا ہے گھر گرہستی تو زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ بلک یہ کہنا سراسر زیادتی ہے کہ مزاح غیر سنجیدہ لوگوں کا کام ہے اس میں زیادہ سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ ذرا پھسلے تو لینے کے

دینے پڑیں گے۔ پھر گھر کا معاملہ تو زندگی بھر کا ہے۔''۱۲

حوالہ جات:

۱۔ زبان اور تہذیب، مشمولہ، کانٹے۔ص۔۶۔۵۔

۲۔ گدھ، مشمولہ کانٹے۔ص۳۰

۳۔ چمچہ گری، کانٹے۔ص۔۴۱

۴۔''دیمک''۔کانٹے، ص۔۶۱

۵۔ ڈاکٹر منصور احمد میر، مشمولہ۔ترسیل، ص۔۷۵

۶۔ کے کے نیر۔مشمولہ۔''غبار کارواں'' ص۲۰۶۔

۷۔''اپنی تو عادت ہے وعدہ کرنا''، مشمولہ۔سن تو سہی۔ص۔۳۰۔

۸۔ بھر پائے خضاب لگانے سے، مشمولہ''سُن تو سہی''۔ص۔۱۰۰

۹۔''بھر پائے خضاب لگانے سے''سن تو سہی، ص۔۱۰۰

۱۰۔ یہ بھی ایک فن ہے لباس اور وضع قطع اختیار کرنا، سن تو سہی، صفحہ نمبر۔۹۰

۱۱۔''اپنی تو عادت ہے وعدہ کرنا'' سن تو سہی، ص۔۳۲

۱۲۔ مزاح گھر کی چار دیواری میں (دو) سن تو سہی۔ص۔۱۲۲

☆☆☆